گم شدہ سفر نامہ

سیرِ تبّت

تصنیف : کوی راج مہتہ بلونت سنگھ

ترتیب و مقدمہ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان

ادارۂ علم و فن پشاور، پاکستان

جملہ حقوق بحق اول ایڈیشن بحق مرتب محفوظ ہیں

نام کتاب	سیر تبت
مصنف	کویراج بلونت سنگھ
تاریخ اشاعت	جولائی 1996ء
تعداد	500
قیمت	120 روپے
ٹائٹل	فرحت
کمپوزر	حافظ محمد جعفر
پریس	تاج پریس جنگی محلہ پشاور
ناشر	کرنل عنایت اللہ خان ایڈووکیٹ صدر ادارہ علم و فن پاکستان پشاور صدر
ملنے کا پتہ	(1) کرنل عنایت اللہ خان ایڈووکیٹ صدر ادارہ علم و فن پاکستان 89 اے صدر لین پشاور صدر (2) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان - ماوری النہر یوسف آباد دلہ زاک روڈ پشاور شہر 240213

مقدمہ

سیر تبت کویراج مہتہ بلونت سنگھ موھن وید واچسپتی آیورد ویدک سکالر کا تصنیف کردہ سفرنامہ ہے۔ بلونت سنگھ ڈی اے وی کالج لاہور کے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ میں بطور آیورووید ک سکالر کام کرتے تھے۔ مئی 1922ء میں بلونت سنگھ نے جڑی بوٹیوں کی تلاش اور تبت و لداخ کے پہاڑوں کی سیاحت کے لئے یہ سفر اختیار کیا ۔ یہ سفر 14 مئی 1922ء کو لاہور سے بذریعہ ٹرین شروع ہوا اور چالیس دن کے پر صعوبت سفر کے بعد جون کے آخری ہفتے میں تمام ہوا۔

لاہور سے بلونت سنگھ رات دس بجے کی گاڑی سے روانہ ہوئے اور صبح پونے چار بجے پٹھان کوٹ پہنچے۔ وہاں سے پھر آگے کا تمام تر سفر پیدل یا بمبوکاٹ (تانگہ) کے ذریعے کیا گیا۔ گویا یہ ایک سفری چلہ تھا جو مصنف نے دور دراز پہاڑی مقامات اور برفانی نظاروں کی سیاحت اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں کاٹا۔ واپس آنے کے بعد انہوں نے ایک مکمل اور دلچسپ سفرنامہ تحریر کیا۔ یہ سفرنامہ اصل سفر کے دو سال بعد چھپا۔ اسے لالہ آسانند ورما اینڈ برادران تاجران کتب و پبلشر لوہاری دروازہ لاہو نے 1924ء میں بندے ماترم پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا۔ پہلا ایڈیشن ایک ہزار کی تعداد میں چھپا۔

میرے سامنے یہ پہلا ایڈیشن ہی موجود ہے۔ اس کی قیمت آٹھ آنے رکھی گئی تھی۔ کتاب کی ضخامت چھوٹی تقطیع کے اسی صفحات ہے اس سفرنامہ کو ناشر نے پہاڑوں میں سیر کرنے والوں اور سیاحوں کا مکمل گائیڈ و رہنما قرار دیا ہے اس وقت اس سفرنامے کا تازہ ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔

اسے دوبارہ چھپوانے کی کیا وجہ ہے اس کے بارے میں کچھ اظہار خیال ضروری ہے۔ راقم السطور کافی عرصہ سے سفرناموں کی ایک تاریخ پر کام کر رہا ہے۔ بعض اندازوں کے مطابق اس وقت اردو میں طبع شدہ سفرناموں کی تعداد نوسو اور ایک ہزار کے درمیان ہے۔ میرا پروگرام سفرناموں کی ایسی تاریخ مرتب کرنا ہے جس میں سفرنامے کے فن اور اس کی موضوعاتی ' زمانی اور اسلوبیاتی درجہ بندی کے ساتھ ساتھ ہر سفرنامے پر ایک ایک ایسا مفصل و جامع اور بھرپور تجزیاتی تبصرہ بھی شامل ہو جو اگر ایک طرف سنجیدہ سفرنامہ پڑھنے والے کے شوق کو مہمیز دے تو دوسری طرف صرف سفرنامے کے موضوع اور اسلوب سے عمومی آگہی حاصل کرنے والے کو اس کی دلچسپی کی جملہ معلومات بھی بہم پہنچا دے۔ اس تبصرے میں تمام سفرناموں سے نمونے کے دلچسپ و موزوں اقتباسات بھی شامل کئے جائیں۔

میں نے اس موضوع پر کام شروع کیا تو میرا اندازہ یہ تھا کہ اردو میں سفرناموں کی تعداد پانچ چھ سو سے زیادہ نہیں۔ ان تمام سفرناموں میں سے ہر ایک کو پوری طرح پڑھے بغیر منصوبے کے مطابق کتاب کا مکمل ہونا ممکن نہ تھا اس لئے میں نے پشاور کی لائبریریوں میں موجود سفرناموں کو پڑھنا شروع کر دیا اس کے بعد نجی ذخیروں سے سفرنامے نکلوا کر پڑھنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں میری سب سے زیادہ مدد پروفیسر خاطر غزنوی صاحب نے کی جن کے پاس نایاب کتب کا ایک بہت بڑا ذاتی ذخیرہ موجود ہے۔ جس کی تعداد 25 ہزار سے زائد بتائی جاتی ہے۔ خاطر صاحب کی کتابوں میں جتنے سفرنامے موجود تھے وہ انہوں نے مجھے پڑھنے کے لئے دئے۔ یوں یہ دریعہ بھی استعمال کر لیا گیا۔

اسی دوران ایک دن ایک خط مجھے گجرانوالہ سے ملا۔ جناب ضیاء اللہ

کھوکھر صاحب نے کسی اخبار میں تبصرہ پڑھنے کے بعد مجھ سے میرے دو سفرنامے بذریعہ وی پی طلب کئے تھے۔ میں نے ان کو سفرنامے تو بھجوا دئے مگر ساتھ ہی ان سے دریافت کیا کہ ان کو سفرناموں سے اس قدر دلچسپی کیوں ہے۔ چند دن کے بعد جواب آیا کہ جناب وہ سفرناموں کے صرف قاری ہی نہیں بہت بڑے کلکٹر بھی ہیں اور ان کے ذاتی ذخیرے میں سات سو سے زیادہ سفرنامے موجود ہیں۔ یہ خبر سن کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کسی بڑی سے بڑی لائبریری میں پندرہ بیس سے زیادہ سفرنامے نہیں ہوتے۔ یہاں ایک شخص کے پاس سات سو سے زیادہ سفرنامے موجود ہیں۔ میں نے اسے حقیقت نہ جانا اور لکھ دیا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا۔

چند دن کے بعد مجھے ایک فہرست موصول ہوئی۔ جس میں سات سو سے زیادہ سفرناموں کے نام ' تعداد صفحات ' سال اشاعت ' ایڈیشن ' قیمت ' موضوع مصنف کے نام ساتھ تفصیل وار درج تھے۔ اب مجھے یقین کرنا پڑا ضیاء اللہ خان اس حوالے دنیا بھر میں اردو سفرناموں کے سب سے بڑے کلکٹر ثابت ہوتے ہیں۔ میں اپنی تمام تر کوششوں اور تلاش کے باوجود پشاور کی لائبریریوں اور نجی ذخیروں کو کھنگالنے کے بعد صرف سو سوا سو سفرناموں تک ہی رسائی حاصل کر سکا تھا۔ دوسری طرف ضیاء اللہ کھوکھر سفرناموں کے پورے خزانے کے مالک تھے۔ ضیاء اللہ صاحب نے سفرناموں میں میری دلچسپی دیکھ کر مجھے دعوت دی کہ میں گجرانوالہ آ کر جب تک چاہوں ان کی ذاتی لائبریری میں سفرناموں کا مطالعہ کرتا رہوں ۔ بڑی زبردست پیشکش تھی مگر یہ میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میں اگر ایک سفرنامہ روزانہ پڑھتا تو بھی مجھے تقریباً" دو سال تک مستقل و مسلسل گجرانوالہ میں ٹھہرنا پڑتا تھا۔ جو میرے لئے ممکن نہ تھا۔

میں نے ضیاء اللہ صاحب سے ڈرتے ڈرتے ایک درخواست کی کہ ہر ہفتے آٹھ دس سفرنامے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھجوا دیا کریں۔ انہیں پڑھنے اور نوٹس لینے کے بعد واپس کر دیا کروں گا۔ ڈاک کا خرچہ دونوں طرف کا میرا ہوگا۔ ضیاء اللہ صاحب نے میری درخواست کو پذیرائی بخشی اور دو تین پیکٹ مجھے بھجوا دئے مگر پھر یہ سلسلہ رک گیا انہوں نے لکھ بھیجا کہ ایسا کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہے یوں میری گاڑی گجرانوالہ سٹیشن پر آ کر رک گئی۔

ضیاء اللہ کھوکھر پیشے کے لحاظ سے بزنس مین اور تربیت کے لحاظ سے انجنیئر ہیں مگر شوق انہوں نے پالا ہے کتابیں جمع کرنے کا۔ کتابوں میں بھی سفرناموں کی ذخیرہ اندوزی کا انہوں نے ایسا انوکھا شعبہ منتخب کیا ہے کہ کمال کر دیا ہے۔ وہ ہر سال ہندوستان جاتے ہیں جہاں کتابوں کی سالانہ نمائش سے سفرنامے اور دوسری مطبوعات خرید کر لاتے ہیں۔ انہیں جہاں سے سفرنامے کی دو جلدیں ملیں ایک مجھے بھیج دیتے ہیں ۔ مجھے بھی یہی فریضہ سرانجام دینا پڑتا ہے وہ ایک دفعہ میرے گھر بھی تشریف لا چکے ہیں۔ مجھے سفرناموں کے سلسلے میں جو رہنمائی حاصل کرنی ہوتی ہے ان سے ہی رجوع کرتا ہوں۔ ایک معاملے پر البتہ ہمارا اتفاق نہیں ہے وہ یہ کہ نہ وہ مجھے اپنے سارے سفرنامے مطالعہ کے لئے دے سکتے ہیں نہ میں دو سال کے لئے گجرانوالہ میں قیام کر سکتا ہوں۔ یوں میرا سفرناموں کی جامع تاریخ لکھنے کا منصوبہ ادھورا رہ گیا ہے اسے بشرط زندگی مکمل ضرور کروں گا (انشاء اللہ) چاہے اس کے لئے مجھے کچھ عرصے کے لئے نقل مکانی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ دوسری طرف میری مشکلات میں یوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ مقبول ترین صنف نثر ہونے کی وجہ سے ہر سال درجنوں کے حساب سے نئے سفرنامے لکھے جا رہے ہیں۔ کام بڑھتا جا رہا ہے عمر گھٹتی جا رہی ہے۔

سفرناموں کے مطالعہ کے حوالے سے مجھے اس موضوع میں لکھی گئی دوسری تصانیف کا مطالعہ کرنا پڑا ہے۔ اب تک سفرناموں کے بارے میں مندرجہ ذیل تین مستند کتابیں /کتابچے سامنے آئے ہیں۔

1۔ اردو کے سفرنامے (انیسویں صدی میں) (1987) از ڈاکٹر قدسیہ قریشی دہلی یونیورسٹی

2۔ اردو ادب میں سفرنامے از ڈاکٹر انور سدید (1988) لاہور

3۔ اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ مقتدرہ قومی زبان (1987)

ڈاکٹر قدسیہ قریشی کا موضوع انیسویں صدی کا سفرنامہ ہے۔ ان کے مقالے میں کل 56 سفرناموں کا ذکر ہے اس مقالے پر ڈاکٹر قدسیہ کو دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ یہ کتاب 1987ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ ڈاکٹر حامد بیگ کا وہ مقالہ ہے جو مقتدرہ قومی زبان نے ان سے اس موضوع پر لکھوا کر چھپوایا ہے۔ اس مقالے کی ضخامت 56 صفحات ہے۔ اور اس میں کم و بیش 120 سفرناموں کا ذکر ہے یہ مقالہ بھی 1987ء میں ہی شائع ہوا۔

سفرناموں پر سب سے مفصل اور جامع تصنیف ڈاکٹر انور سدید کی 744 صفحات پر مشتمل کتاب ہے جس میں کوئی 442 سفرناموں کا ذکر ہے اور ان پر مختصر تبصرے شامل ہیں یہ کتاب 1988ء میں چھپی۔ اس کے بعد ضیا ساجد کی کتاب "اردو کے شاہکار سفرنامے" کے عنوان سے 1992ء میں لاہور سے چھپی۔ 512 صفحات کی اس کتاب میں اردو کے چند بہت مشہور و معروف سفرناموں کا تفصیلی ذکر اور ان کے منتخب حصے شامل ہیں۔

میرا سفر یہاں آ کر رک گیا ہے۔ تاہم سفرناموں کی تلاش جاری

ہے۔ اس دوران میری نظر سے سیر تبت نامی سفرنامہ گزرا۔ اسے پڑھنے کے بعد میں نے ڈاکٹر قدسیہ ' ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی فہرستوں کا مطالعہ کیا۔ کسی فہرست میں اس کا تذکرہ موجود نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے مذکورہ بالا افراد کو خطوط لکھے ان میں سے صرف ڈاکٹر انور سدید کا خط موصول ہوا۔ انہوں نے یہ بات لکھ کر مجھے حیران کر دیا کہ کویراج مہتہ کا سفرنامہ سیر تبت ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ ضیاء اللہ کھوکھر کی فہرست میں بھی اس کا ذکر موجود نہ تھا۔ خط و کتابت کرنے پر ضیاء اللہ صاحب نے بھی تصدیق کر دی کہ یہ سفرنامہ ان کے ذخیرے میں موجود نہیں ہے ۔

ہو سکتا ہے اس سفرنامہ کی نقل شاید کسی غیر معروف لائبریری یا کسی دور پار کے علاقے کے صاحب علم کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہو مگر سفرنامہ کے مورخوں اور کلکٹرز کی تحقیق کے مطابق یہ سفرنامہ کسی دوسری جگہ موجود نہ تھا۔ جب میں نے اس کی کاپی میونسپل لائبریری پشاور میں دیکھی تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ یہ لائبریری 1924ء میں ہی قائم ہوئی۔ اسی سال یہ سفرنامہ چھپا اور اسی سال لائبریری کے ذخیرہ کتب میں شامل ہو گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ محفوظ رہ گیا۔ میں نے اپنے دوست معروف شاعر اور میونسپل لائبریری کے چیف لائبریرین جناب شین شوکت سے اس سفرنامے کو دوبارہ چھاپنے کی بات کی انہوں نے بخوشی رضامندی ظاہر فرما دی۔ یوں یہ گم شدہ سفرنامہ چھپ کر دوبارہ منظر عام پر آ رہا ہے۔ میری اس ساری محنت کا منشا یہ ہے کہ یہ گم شدہ سفرنامہ منظر عام پر آ کر سفرنامے کی تاریخ میں اپنی جگہ پا لے۔ اس طرح تاریخ کا وہ حصہ بھی محفوظ ہو جائے جو اس سفرنامے کے گرد آلود صفحات میں مقید ہو چکا ہے۔ اب آیئے اصل سفرنامے کی طرف

کویراج بلونت سنگھ نے اپنے سفرنامے لکھنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے

کہا ہے۔

"اس کتاب کے لکھنے سے صرف یہ غرض مقصود ہے کہ لوگوں کو ان علاقوں کی نسبت جہاں کہ آبادی بہت کم نئی پیداوار نئے باشندے غرضیکہ ہر بات نئی ہو ہر ممکن پہلو سے واقفیت ہو"

مصنف ایک آیورویدک حکیم اور محقق تھا۔ اس لئے اسے جڑی بوٹیوں کی تلاش کے پہاڑوں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ اس کا پہلا سفر نہ تھا اس سے پہلے بھی وہ اس قسم کے سفر کرتا رہا ہے

مصنف لکھتا ہے۔

"ہم پچھلے سال پہلے سفر کی تکلیفوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خاص خاص جڑی بوٹیوں کے تحقیقاتی شوق اور آیورویدشاستر کے سدھانتوں کی انتہا کے لئے دریائے بیاس ' چناب اور راوی کے مختلف سمتوں میں ہونے والے دور دراز منعبوں پر جا پہنچے اور ان سے پرے سنٹرل ہمالیہ کے علاقوں کیس سیر کرتے چنبہ کے راستے واپس آ نکلے۔

مصنف ایک مہم جو قسم کا آدمی ہے اور تمام مشکلات و مصائب کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے چنانچہ لکھتا ہے۔

"ہم اپنے سفر کے دوران 19000 فٹ کی اونچائی کی برفانی چوٹی پر بغیر کسی آپریٹس کی مدد کے جان ہتھیلی پر رکھ کر پہنچ گئے"

اس کے ساتھ مصنف کو احساس ہے کہ وہ چونکہ ایک پیشہ ور کوہ پیما کی شہرت نہیں رکھتا اور نہ اس کا تعلق یورپ و امریکہ سے ہے اس لئے اس

کی اس کوہ پیمائی کا تذکرہ نہ کسی اخبار میں چھپا ہے اور نہ ہی اسے ذرائع ابلاغ نے کوئی اہمیت دی ہے۔

مصنف ایک پڑھا لکھا آدمی ہے ملک کے سیاسی و معاشی حالات سے باخبر ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ پرانے سفرناموں میں کیا لکھا گیا ہے اور ہیون سانگ اور دوسرے سیاحوں نے ان علاقوں کی سیاحت کے دوران کیسی کیسی تکالیف برداشت کیں تھیں۔ وہ نئے دور کے ان سیاحوں پر طنز بھی کرتا ہے جو آرام دہ گاڑیوں میں بیٹھ کر سفر کرتے ہیں اور پھر سفر کا حال لکھ کر سفرنامہ ترتیب دے دیتے ہیں۔ سب سے پرلطف بات یہ ہے کہ مصنف کی عمر سفر کے وقت بائیس تئیس سال کے درمیان ہے ۔ مصنف اس بارے میں رقم طراز ہے۔

"اس سیر کے ساتھ قدرتی نظاروں اور خدائی منظروں کا ظہور تھا وہاں وہ لطف اٹھانے کے لئے بڑی سختیاں اور اپنے سفروں کی مصیبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔ پہلے زمانے کے سفر کا نظارہ جوکہ اپنے بزرگوں سے سنتے تھے اور پرانے سیاحوں / سفرناموں سے معلوم کرتے تھے وہ اپنے پاؤں چل کر اب معلوم کر لئے۔ ہم ہی قیاس کر سکتے ہیں ہیون سانگ جیسے چینی سیاح کیسے چین اور تبت کے پہاڑوں کو پار کرتے ہوئے کن کن مصیبتوں کو برداشت کر کے ہندوستان میں پہنچے اور یہاں کے حالات تواریخی طور پر اکٹھے کئے۔ ایسے سفر انسان کو بڑا تجربہ سکھاتے ہیں یہ آزمائش قومی و باحوصلہ ہر طرح کے حال میں شاکر انسان کے لئے ہے۔ نہ ہی اس

کے لئے جو کہ لاہور سے امرت سر بذریعہ کلکتہ جاتے وقت
کافی راستہ کیک بسکٹ مٹھائی وغیرہ ساتھ لیتے ہیں اور گاڑی
باہر والی سنگل کے پاس ہونے پر ہی قلی کو پکارنا شروع کر
دیتے ہیں اس عیش و آرام کی زندگی نے ہماری قوم کو تباہ
کر دیا ہے اور ہر بات میں غیروں کی دست نگراں ہے۔

یہ سفرنامہ مصنف قدیم سفرناموں کے انداز میں ڈائری کی صورت میں تاریخ وار لکھا ہے۔ روزانہ پیش آنے والے واقعات کو وہ روز کے روز لکھتا جاتا ہے۔ اکثر اوقات تاریخ کے ساتھ وقت بھی لکھ دیتا ہے۔ مثلاً" سفر کا آغاز لاہور سے رات دس بجے بذریعہ ٹرین ہوتا ہے۔ صبح پونے چار بجے گاڑی پٹھان کوٹ پہنچتی ہے۔ وہاں سے تانگے کا یا پیدل سفر شروع ہوتا ہے۔ چار بجے صبح سے ہی بمبوکلٹ کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ ساڑھے سات بجے نور پور پہنچتا ہے۔ دن بھر سیر کرنے کے بعد چار بجے شام پھر سفر کا آغاز کر دیتا ہے۔ رات دس بجے کوٹلہ پہنچتا ہے۔ وہاں ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد گیارہ بجے گھپ اندھیرے میں آگے سفر شروع کر دیتا ہے۔ رات ایک بجے شاہ پور گاؤں پہنچتا ہے۔ وہاں کمر سیدھی کرنے کے بعد آگے روانہ ہو جاتا ہے۔ اس دوران وہ چار ہزار سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع گاؤں دھرم سالہ پہنچ جاتا ہے۔ اس نے ایک دن اور ایک رات میں پٹھان کوٹ سے 52 میل کا سفر تانگے اور پیدل کیا ہوتا ہے چودہ مئی کی رات کو سفر شروع کیا تھا۔ پندرہ سولہ مئی سفر میں کٹے۔ سترہ اور اٹھارہ مئی کے دو دن دھرم سالہ میں گزارے۔ انیس مئی کو بستر کاندھے پر رکھ کر آگے روانگی شروع ہو جاتی ہے۔ رات کو کسی جگہ پہنچا ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے مگر مچھروں کی یلغار

میں سو گیا۔ 20 مئی کو گوپال پورہ قصبہ میں پہنچا۔ وہاں عجیب منظر دیکھے۔ لکھتا ہے۔

"یہاں ہفتہ میں ایک دن شکار کے لئے ہوتا ہے۔ یہ لوگ لومڑی گیدڑ سانپ ' مینڈک ' سب چٹ کر جاتے ہیں۔ چالاک بڑے ہیں۔ مختلف جانوروں کی بولیاں بولتے ہیں ایک دفعہ لومڑی یا گیدڑ دیکھ لیں دوڑ کر فوراً" پکڑ لیتے ہیں "

یہ ایسی اطلاع ہے جو شاید کسی کتاب میں درج نہ ہو۔ برصغیر کے لوگوں کے بارے میں یہ اطلاعات موجود نہیں کہ وہ لومڑ یا گیدڑ بلیاں کتے کھا جاتے ہیں۔

گوپال پور سے 22 مئی کو روانہ ہوا۔ پالم پور پہنچا۔ 23 مئی کو وہاں قیام کیا۔ وہاں سے چل کر بیج ناتھ آیا پہاڑ کی چوٹی پر واقع یہ گاؤں مصنف کے خیال میں اچھا نہیں ہے۔ دو میل آگے چل کر برٹش علاقہ ختم ہو جاتا ہے اور منڈی ریاست شروع ہو جاتی ہے۔ 24 مئی کو بیج ناتھ میں قیام کیا۔ 25 مئی کو منڈی کی طرف روانہ ہوا۔ یہ سارا دن سفر میں کٹا۔ ڈھیلو ' گمان اور جھنگڑی سے ہوئے ہوئے ارلا پہنچا۔ اس دن 26 میل سفر کیا تھا۔ رات وہاں قیام کیا۔ پسوؤں نے سب سے زیادہ تنگ کیا۔ 26 مئی صبح 3 بجے ارلا سے روانہ ہو گئے اور ساڑھے آٹھ بجے درنگ نالی جگہ پر پہنچا۔ جو ارلا سے 14 میل کے فاصلے پر ہے وہاں چند گھنٹے آرام کیا اور ڈیڑھ بجے وہاں سے چل پڑا۔ شام کو منڈی پہنچا اس دن 50 میل کا سفر کیا تھا۔ منڈی شہر میں مندر بہت زیادہ تھے مگر لوگ صفائی پسند نہ تھے۔ ہر جگہ پیشاب کی بو آتی تھی۔ 95 فیصد لوگ ہندو تھے مسلمان شاذو نادر ہی نظر آتا تھا لوگ بڑے شوقین مزاج

تھے۔ شراب اور گوشت کے رسیا تھے۔ جواری بھی بہت تھے۔ اپنی بدمعاشیوں کی وجہ سے سوزاک اور آتشک کے مریض تھے۔ مصنف جہاں جاتا ہے وہاں کی عورتوں کے متعلق اپنی رائے ضرور دیتا ہے۔ منڈی کی عورتوں کے متعلق لکھتا ہے۔

"یہاں عورتوں میں درپردہ بدمعاشیاں بہت بڑی ہوئی ہیں۔ سنا ہے عورتیں بہت کم نہاتی ہیں روزانہ منہ دھو لیتی ہیں۔ رنگت اچھی ہے۔ ون بالکل نام نہیں۔ ہر طرف یرقان ہی نظر آتا ہے یہاں عورتوں کی شادی شہر کے اندر ہی ہوتی ہے سارا دن عورتیں اپنے میکے میں گھر میں رہتی ہیں اور رات کو سسرال میں آجاتی ہیں۔ لکھنائی وغیرہ کا بڑا استعمال کرتی ہیں اور زیادہ تر روگ سے راہ عدم کو روانہ ہو جاتی ہیں کھانے کو ملے نہ ملے لیکن با نکپن ضرور کریں گی۔ پردہ کا رواج کوسوں دور ہے۔ اور عام کھلے یورپین فیشن کے انوسار پھرتی ہیں۔"

منڈی ریاست میں مصنف نے جھیل میں تیرتے ہوئے ٹیلوں کا بھی ذکر کیا مصنف چونکہ دودھ پینے کا شوقین ہے مگر اس منڈی ریاست میں دودھ بالکل دستیاب نہیں ہوتا۔ نہ ہوٹل ہے نہ کھانے کا بندوبست ہے۔ انتیس مئی تک دو دن وہاں ٹھہرنے کے بعد 30 مئی کو منڈی سے صبح 5 بجے روانگی ہوتی ہے۔ نصف راستہ بھر دودھ تلاش کرتا رہا مگر دودھ اول تو ملا نہیں جہاں ملا وہ بھی نخالص۔ اس تاریخ کو سوا دس بجے کٹولہ پہنچا۔ یہ منڈی سے 14 میل دور تھا۔ یاں قلی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ایک گھنٹے آرام کرنے کے بعد خود

سامان اٹھا کر چلا۔ ایک اور مسافر ساتھ تھا جو کسی اگلے گاؤں میں اپنے لئے عورت خریدنے جا رہا تھا۔ شام چھ بجے تک یہ کٹھن سفر جاری رہا اس سفر کی منظر کشی کرتے ہوئے بلونت سنگھ لکھتا ہے۔

"ایک پتھر سے دوسرے پر کود سیڑھیوں نے اتر اتر کر پانی میں چھلانگیں ۔ر کر کبھی اوپ کبھی نیچے بابے آدم کے وقت کا راستہ کہیں کانٹے دار جھاڑیاں کہیں مرے ہوئے گدھوں اور جانوروں کا پنجر ' سنسان جنگل ' عجیب جگہ جا پہنچے۔ ناک میں دم آ گیا گھٹنے رک گئے۔ ٹانگیں شل ہو گئیں۔

دن بھر 30 میل سفر کیا تھا رات ساڑھے نو بجے پڑاؤ جا پہنچا۔ کشمش گری تھوڑی سی چبائی اور بستر بچھا کر سو گیا۔ دن کو ایک بجے وہاں سے روانہ ہوا شام کو چھوٹے سے گاؤں بھونتر پہنچا۔ وہاں رات بھر قیام کیا 31 مئی کا دن سفر میں گزرا تھا۔ یکم تا تین جون بھونتر میں گزارے چار جون کو بھونتر سے ڈیڑھ بجے دن روانہ ہوا اور شام سوا پانچ بجے کلوجا پہنچا۔ یہاں کی سب سے بڑی خصوصیت مصنف کے لئے یہ ہے کہ یہاں سردیوں میں دودھ بڑا خالص اور سستا ملتا ہے۔ یہاں دسہرہ کے دنوں میں زبردست میلہ لگتا ہے جس میں عورتیں پسند کرکے خریدی جاتی ہیں۔ مصنف کا خاص موضوع عورتیں ہیں اس لئے وہ کلو کی خواتین کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"زمین کا سارا کام سوائے ہل چلانے کے عورتیں ہی کرتی ہیں۔ مردوں کی نسبت عورتیں خوبصورت مضبوط اور محنتی ہیں۔ ان عورتوں کا چال چلن اچھا نہیں ہوتا۔ یہ ٹکے کی غلام ہیں۔ ان کے والدین ان کو خود سنگار کر شہر میں لاتے

ہیں۔ ایک کے ساتھ برائے نام شادی کر دی۔ وہاں سے کچھ لیا پھر وہ لڑکی وہاں سے بھاگ آ گئی۔ والدین نے دوسرے کے ساتھ شادی کرکے اور روپیہ بٹور لیا۔ آتشک ' سوزاک ' کوڑھ یہاں عام ہے۔ جس لڑکی کو یہ بیماری ہو جاوے اس کو امتحان میں پاس گنا جاتا ہے۔

مشٹنڈے سادھو اس طرف عورتوں کی خاطر چلے آتے ہیں۔ ان لوگوں میں شرم حیا کچھ نہیں ہوتی ہے۔ لوگ بڑے تنگ دل اور ادھری ہیں ان کی دولت زیادہ تر بھیڑ اور بکریاں ہیں۔ گھر میں اگر ایک عرت ہو اور تین چار بھائی ہوں تو بھی گزارا کر لیتے ہیں "

پانچ اور چھ جون کے دن کلو میں گزارے۔ کلو سے لداخ ڈیڑھ ماہ کے فاصلہ پر ہے۔ کلو سے اٹھائیس میل کے فاصلے پر منی کرن کے گرم چشمے میں اس میں آدمی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ ان چشموں میں کپڑے کے اندر چاول باندھ کر ڈال دیں تو دس منٹ میں گل جاتے ہیں۔ دس جون کو دوپہر بارہ بجے شہرنگر کی طرف روانہ ہوا۔ دس میل تک چلتا رہا۔ اس کے بعد ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں نظر آنے لگیں۔ راستے میں کڑاؤں گاؤں آیا جو کلو سے 14 میل کے فاصلے پر تھا۔ گیارہ جون کو آگے چلے اور نگر پہنچے یہ جگہ کافی ٹھنڈی تھی۔ اسسٹنٹ کمشنر بھی یہیں رہتا تھا۔ یہاں سورج عموماً" بادلوں کا گھونگھٹ پورے طور پر اتار کر درشن نہیں دے سکتا۔

بارہ جون کو صبح دس بجے نگر سے روانہ ہوا۔ آٹھ میل کا فاصلہ طے کیا تو ابر چھا گیا سخت بارش میں بھیگ گیا۔ چلتے چلتے منالی پڑاؤ پہنچا۔ لاہولی

لوگ راستے میں ملے جو چائے میں گھی ملا کر پی رہے تھے۔ یہاں سے آگے پھر اور ہی رنگ کا نمونہ شروع ہو جاتا ہے لوگوں کے ناک نقشے چینیوں کی طرح موٹے موٹے منہ چپٹی ناک۔ آگے چل کر .ششٹ جی کا مندر ملا۔ وہیں رات گزاری ۔ یہاں ساٹھ گھر ہیں۔ فصل وغیرہ کا کام ان کی عورتیں کرتی ہیں ان کی لڑکیاں کھلی رہتی ہیں شادی کرنے کی کوئی خاص رسومات نہیں جو لڑکی جس کو مرضی ہو اپنا خاوند منتخب کر لے۔ کوئی منع نہیں کرتا۔ لڑکی جب چاہے اپنے پہلے خاوند کو چھوڑ کر دوسرے کو لے کر یا والدین کے گھر آ بیٹھے۔ یہاں ایک دکان ہے ۔ یہ دکاندار بھی سردی کے دنوں میں یہاں سے چلا جاتا ہے۔

تیرہ جون کو منالی میں آرام کیا۔ چودہ جون کو یعنی اپنے لاہور سے روانگی کے دن سے ٹھیک ایک ماہ بعد منالی سے دن دو بجے روانہ ہوا۔ سات میل کے فاصلے پر ریلا کا ڈاک بنگلہ ہے جو پی ڈبلیو ڈی کی ملکیت ہے۔ یہاں رات کاٹی۔ سردی بڑی سخت تھی ساتھ دریا شاں شاں کر رہا تھا۔ صبح سویرے پندرہ جون کو روانہ ہوا۔ لگاتار چار میل تک برف ہی برف تھی۔ ایک دفعہ میں بسترہ پر بیٹھ گیا اور روسی لوگوں کی طرح پھسلنے لگا۔ نیچے پہنچا تو سامنے دریا آ گیا۔ اب اسے عبور کرنا ایک مسئلہ تھا راستہ بہت خراب تھا۔ قلی غلط راستے پر لے گیا۔ راستے میں دیکھا کہ کسان ہل چلا رہے ہیں یہاں زمین کا زیادہ تر کام عورتیں ہی کرتی ہیں۔

یہ لوگ مہمان نواز تو کجا سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ رات کو بھیڑ بکریوں کے کھلڑ اوڑھ کر سو رہتے ہیں۔ یہاں کھانا مرد بناتے ہیں اس لئے وہ کھیتوں سے پہلے آ جاتے ہیں۔ یہاں رات گزاری ساری رات پسو لڑتے رہے۔ دو دن کے بھوکے دل نے رونا چاہا۔ صبح جلدی روانہ ہوا۔ دس

میل کا فاصلہ طے کیا کہ قلی نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ سارا دن چلنے کے بعد شام ساڑھے سات بجے کیلانگ پہنچا۔ ایک پادری صاحب کی خالی کوٹھری میں جا لیٹا۔ پادری سے صبح ملاقات ہوئی۔ اس نے کچھ سیب دئے جو پچھلے سال کے تھے جگہ ٹھنڈی ہے اس لئے پھل رکھ لینے سے خراب نہیں ہوتے۔

کیلانگ لاہول کے علاقے کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں کی گلیاں بڑی گندی اور مکان سب تنگ برآمدے والے ہیں۔ لوگ گلیوں میں ہی پاخانہ وغیرہ پھر لیتے ہیں۔ پانی کو چھونا پاپ سمجھتے ہیں۔ یہاں سے لداخ 150 میل ہے زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی ہے راستہ عموماً خطرناک ہے لوگ لٹیرے بہت ہیں۔ سولہ سترہ جون کے دن سفر میں گزر چکے تھے۔ 18 جون کو بروز اتوار ترلوک ناتھ کی طرف روانہ ہوا۔ نو بجے لالوٹا گاؤں پہنچا۔ ٹھاکر صاحب سے ملا اس نے ایک کتاب دکھائی۔ کتابوں کا یہاں بڑا ذخیرہ ہے۔ ٹھاکر نے بتایا کہ اس کا آنا قبل از وقت ہے۔ کیونکہ بوٹیاں نکلنے کا اصل موسم جولائی اگست ہے۔ ٹھاکر نے کہا کہ ترلوک ناتھ کا راستہ خطرناک ہے۔ اس طرف مت جاؤ۔ خیر لالوٹا سے روانہ ہوا۔ دریائے چناب پر رسوں کا پل تھا اسے عبور کیا۔ برنگ گاؤں پہنچا۔

انیس جون کو وہاں سے دو قلیوں کو ساتھ لے کر چلا۔ راستے میں سنسان جگہ پر آگ جلا کر رات کاٹی۔ بیس جون کو صبح سویرے وہاں سے چلا۔ اب پہاڑی کی چوٹی پر چڑھنا تھا۔ چار گھنٹے چلا مگر کافی راستہ باقی تھا۔ اتنے میں توپ کی آواز آئی سمجھا بھونچال ہے۔ اتنے میں ایک پہاڑی میں شگاف ہوا اور وہاں سے ایک بڑا بھاری برف کا ٹکڑا شاید 20 من وزنی نیچے لڑھک آیا۔ مگر وہ بچ گیا سارا دن چلتا رہا۔